محمد علی جوہر اور مسئلہ حجاز

ڈاکٹر مس شاہدہ الیاس

۱۹۲۴ء فرقہ وارانہ تحریکوں کیلئے دور شباب تھا۔ جس میں ہندو مسلم فسادات کا ایک طویل اور خوفناک سلسلہ چل نکلا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی مزید بڑھ گئی، ہندو مسلم تعلقات میں بڑھتی ہوئی کشیدگی کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۲۳ء میں گیارہ، ۱۹۲۴ء میں اٹھارہ، ۱۹۲۵ء میں سولہ، ۱۹۲۶ء میں پینتیس اور نومبر ۱۹۲۷ء تقریباً سینتیس ۳۷ ہندو مسلم فسادات ہوئے[۱]۔ ہندو مسلم تعلقات کو خراب کرنے کی ابتداء ہندوؤں کی جانب سے ہوئی۔ جنھوں نے پنڈت مدن موہن مالویہ، لالہ لاجپت رائے اور شردھانند کی زیر قیادت شنگھٹن اور شدھی تحریکیں شروع کیں۔ ان دونوں تحریکوں کا مقصد ہندوستان سے مسلمانوں کے وجود کو ختم کرنا تھا۔ ان ہندو تنظیموں کے مقابلے میں مسلمانوں نے بھی ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور میر غلام بھیک نیرنگ کی زیر قیادت تنظیم اور تبلیغ کے نام سے دو جماعتیں قائم کرلیں، سارے بگاڑ اور فساد کی وجہ یہ تھی کہ اب انکے سامنے کوئی واضح اور متعین پروگرام نہیں تھا، جس پر عمل پیرا ہوکر وہ صحیح جانب قدم اُٹھا سکتے، یہی چیز ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات کا باعث ثابت ہوئی۔ محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء تا ۱۹۳۱ء) کیلئے یہ دور بہت ہمت شکن اور حوصلہ فرسا تھا۔ وہ ترکی میں خلافت کے خاتمے (۱۹۲۴ء) کی وجہ سے شدید کرب کا شکار تھے کہ خانگی مسائل نے اس میں مزید اضافہ کردیا۔ ۱۱، مارچ ۱۹۲۴ء کو محمد علی کی چھوٹی صاحبزادی آمنہ بعارضہ دِق انتقال کر گئیں۔ اسی سال ۱۲ اور ۱۳ نومبر کی درمیانی شب بی اَماں، جو محمد علی کیلئے ڈھال تھیں، داغِ مفارقت دے گئیں۔ انکی اپنی صحت جو برسوں سے خراب چلی آرہی تھی، تیزی سے بگڑتی چلی گئی، اس پر طرہ یہ کہ معاشی پریشانیوں میں گھرے رہے۔ اگرچہ انھوں نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو دہلی سے کامریڈ، اور ۸ نومبر ۱۹۲۴ء کو ہمدرد، کا دوبارہ اجراء کردیا[۲]۔ لیکن سیاسی مصروفیات کی وجہ سے انھیں وقت نہ دے سکے۔ لیکن انھوں نے ان تمام حالات کا غیر معمولی استقامت اور نہایت

ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا۔

محمد علی اگر چاہتے تو تبلیغ میں شامل ہوکر، کانگریس کی مخالفت کر کے اپنا سیاسی قد بڑھا سکتے تھے، لیکن انھوں نے رائے عامہ اور عام میلان کی پرواہ نہ کی، بلکہ قوم کیلئے جو علاج بہتر سمجھتے تھے اسکا تجربہ قوم پر کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ ساتھیوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا، موتی لال نہرو نے چیمبر پریکٹس شروع کردی۔ سی۔آر۔داس سوراج پارٹی کے تاجدار بن گئے[۳]۔ دوسری طرف علماء کا گروہ تنظیم وتبلیغ، قائم کر کے پورے طور پر الگ ہو چکا تھا، مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۳ء تا ۱۹۷۷ء) مولانا نثار احمد کانپوری اور دوسرے اہم بزرگ رہنما خلافت سے بیزار ہوکر تنظیم، کے رکن بن چکے تھے[۴]۔ غرض مسلمانوں میں مختلف گروہوں یا پارٹیوں نے جنم لیا۔ جن میں نیشنلسٹ مسلمان، کانگریسی مسلمان، انجمن احرار اور خدائی خدمت گار وغیرہ سرفہرست تھے۔ مولانا حسرت موہانی (۱۸۷۵ء تا ۱۹۵۱ء) نے ان جماعتوں پر کیا خوب تبصرہ کیا ہے۔ کہ یہ جماعتیں اور پارٹیاں اس قسم کی ہیں، جیسے جنگ پلاسی میں مسلمانوں کی قوت ٹوٹنے کے بعد بہت سے سرداروں نے اپنے اپنے جتھے بنالئے تھے، خود انکا کوئی مقصد اور مطمع نظر نہ تھا، جو روپیہ دیتا تھا اسی کی طرف سے جنگ لڑنے لگتے تھے[۵]۔ جمعیت العلمائے ہند نے مولانا عبدلباری فرنگی محل (۱۸۷۸ء تا ۱۹۲۶ء) کے زیر اثر الگ سیاسی پلیٹ فارم کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ مسلم لیگ بھی ڈھڑے بندیوں کا شکار ہو چکی تھی۔ بحیثیت مجموعی اس پورے دور میں سیاست انتشار کا شکار رہی۔ جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوؤں نے مسلم قوم کے الگ تشخص کو مٹانے کی کوششیں شروع کردیں، اس سلسلے میں انھیں متحدہ قومیت کے حامی مسلمانوں کی تائید و حمائت بھی حاصل ہو چکی تھی۔

اس بحرانی دور میں ایک نیا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا کہ حجاز میں غیر معمولی صورتحال پیدا ہوگئی، جنگ عظیم اوّل (۱۹۱۸ء تا ۱۹۱۴ء) کے بعد حکومت برطانیہ کی سرپرستی میں وہاں شریف حسین کی حکومت قائم ہوگئی تھی، جو آل رسولؐ

سے تھے، لیکن انگریزوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ اس لئے عالم اسلام میں اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ اسکے باوجود شریف حسین خلیفہ بننے کی فکر میں تھے۔ حالانکہ انکے اقدامات انتہائی منفی تھے۔ وہ اپنے خاص خاص نمائندوں کے ذریعے مسلمانوں سے بیت لیتے۔ حاجیوں کو تنگ کرتے۔ بے گناہ مسلمانوں اور حجازیوں کا خون بہانے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ شریف حسین نے انگریزوں کی مدد سے پورے جزیرہ العرب کا بادشاہ بننے کی بھی کوشش کی تھی [۶]۔ انہوں نے اپنے بیٹے امیر فیصل کو انگریزوں کے تعاون سے عراق کا حکمران بنوایا اور دوسرے بیٹے امیر عبداللہ کو شرق اُردن کا حکمران تسلیم کرالیا۔ نجد کے سلطان عبدالعزیز بن مسعود (۱۸۸۰ء تا ۱۹۵۳ء) سے شریف مکہ کی پرانی عداوت تھی۔ اسلئے شریف حسین نے اہل نجد کو حج سے روک دیا۔ جس سے بالآخر دونوں فریقوں میں باضابطہ جنگ چھڑ گئی۔ ستمبر ۱۹۲۴ء میں نجدی فوجیں طائف میں داخل ہوگئیں۔ وہاں شریف حسین کے بیٹے امیر علی حکمران تھے وہ طائف چھوڑ کر مکہ معظمہ بھاگ گئے۔ جب نجدی فوجیں مکہ معظمہ کی طرف بڑھیں تو شریف حسین اور امیر علی دونوں جدہ چلے گئے۔ وہاں شریف حسین نے خود تو حکومت سے علیحدگی اختیار کر لی لیکن امیر علی کو ملک الحجاز بنا دیا [۷]۔ اسکے باوجود ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک ایسا طبقہ تھا، جو شریف حسین کی اسلئے حمایت کر رہا تھا کہ وہ آل رسولؐ اور نجیب الطرفین ہیں لہذا اقتدار کے اصل حقدار وہی ہیں۔ انہوں نے ابن مسعود کو وہابی قرار دیتے ہوئے انکے خلاف پروپگنڈہ شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ طبقہ بھی شریف حسین کے افعال واعمال سے نالاں تھا۔ مسلمان قوم کی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ اس نے فروعی اختلافات کا شکار ہو کر ہمیشہ اپنا ہی نقصان کیا۔ جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے کی بجائے تنقید برائے تنقید یا تقلید برائے تقلید کی روش اختیار کر کے اغیار کو مضبوط ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔

محمد علی جوہر جو حجاز کی صورتحال سے سخت پریشان تھے۔ انہوں نے خلافت کانفرنس کی طرف سے ایک وفد سید سلیمان ندوی کی سربراہی میں ۱۸ دسمبر ۱۹۲۴ء کو حجاز روانہ کیا، مولانا عبالماجد دریابادی اور مولانا عبدالقادر قصوری وفد

کے اراکین میں تھے [۸]۔ وفد ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے یہ پیغام لیکر گیا کہ:۔

۱۔ حجاز میں اسلامی شرع کے اصولوں پر جمہوری حکومت قائم ہو۔

۲۔ حجاز کی اندرونی آزادی کو مکمل طور پر برقرار رکھا جائے۔

۳۔ وہ تمام مسائل جو حجاز کی اسلامی مرکزی حیثیت سے تعلق رکھتے ہوں مسلمانانِ عالم کی مرضی سے طے ہوں۔

۴۔ ان مسائل کے حل کیلئے ایک ایسی اسلامی موتمر کا انعقاد ہو جس میں تمام اسلامی ممالک کے نمائندے شامل ہوں۔

۵۔ حجاز کی جمہوریت کے ساتھ شریف حسین اور اسکے خاندان کا کوئی تعلق نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔

جدہ میں شریف حسین کے بیٹے امیر علی کی حکومت تھی، وفد نے امیر علی اور انکے وزراء سے ملاقاتیں کیں۔ لیکن انہوں نے کہا کہ حجاز میں جمہوری حکومت قائم کرنا ناممکن اور موتمر اسلامی کا انعقاد بے سود ہے۔ اسوقت سلطان ابن مسعود سے جنگ جاری تھی۔ وفد کو جدہ سے آگے جاکر ابن مسعود سے ملاقات کی اجازت اس شرط پر دی گئی کہ وہ ابن مسعود کو قائل کریں گے کہ امیر علی کو حجاز کا اصل بادشاہ تسلیم کرلیں۔ ظاہر ہے یہ شرط پوری نہیں ہوسکتی تھی۔ لہذا وفد بڑی پریشانیوں کے ساتھ جدہ ہی سے واپس ہندوستان آ گیا [۹]۔ دوران جنگ ابن مسعود نے اعلان کیا کہ میں حجاز پر اپنی بادشاہیت قائم کرنے نہیں جارہا ہوں، بلکہ میں تو اس ارض پاک کو شریفوں کے پنجے ظلم وستم سے نجات دلانے کو اُٹھا ہوں۔ زریات شریف کے نکل جانے کے بعد مسلمان جانیں اور ان کا کام۔ وہ جسے چاہیں اپنا حکمران منتخب کرلیں گے [۱۰]۔ اس اعلان سے محمد علی جوہر کو یوں محسوس ہوا، جیسے انکی مدتوں کی خواہش پوری ہوتی ہوئی نظر آرہی ہے کہ ترکی کا نعم البدل انھیں حجاز میں مل جائے گا، یعنی شریف حکومت کو حجاز سے نکال دیا گیا تو وہاں بادشاہیت کی بجائے تمام

اسلامی ممالک کے اشتراک سے ایک شرعی جمہوریت قائم ہو جائے گی، جہاں عالم اسلام کی رائے اور مشورہ سے حکومت ہوگی۔ مسلمانوں کی مرکزیت قائم ہوگی۔ محمد علی کو یقین ہوگیا کہ حجاز میں شریعت مطہرہ قائم ہوکر رہے گی اسلئے وہ سلطان ابن مسعود کے طرفدار ہو گئے۔ لیکن جلد ہی اخبارات میں یہ خبریں شائع ہوئیں کہ ابن مسعود کی فوج نے مدینہ منورہ پر حملہ کر کے گولہ باری کی اور مسجد نبویؐ کے اُن گنبدوں کو نقصان پہنچایا ہے، جہاں رسول کا روضہء اطہر ہے۔ اس سے مسلمانان ہند میں شدید غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ محمد علی جوہر نے اس واقعہ کو جنگ کا ایک اتفاقی حادثہ قرار دیا لیکن مولانا عبدالباری فرنگی محل اور انکے ہم خیال ابن مسعود کے سخت خلاف ہو گئے [11]۔ اور انہوں نے خدام الحرمین قائم کر کے سلطان ابن مسعود کی مخالفت شروع کر دی۔

محمد علی جوہر کیلئے بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ ایک طرف انکے مخلصانہ جذبات تھے، دوسرے طرف انکے مرشد کے خیالات تھے۔ لیکن وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہوگئے اور مرشد سے اختلاف مول لے لیا۔ جب ابن مسعود نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی قبروں کو مسمار کرنا شروع کیا تو اس سے مسلمانوں میں اور بھی اشتعال پیدا ہوا۔ لیکن محمد علی جوہر ابن مسعود ان تمام اقدامات کو اس لئے نظر انداز کرتے رہے کہ انکے ذریعے حجاز میں ایک شرعی حکومت قائم ہوگی، لیکن ایسی شرعی حکومت کا کیا فائدہ جسے قائم کرنے والے اسکے قیام سے پہلے ہی مسلمانوں کو ذہنی کرب اور اذیت میں مبتلا کر دیں۔ ایسے شخص سے حقیقی شرعی جمہوری کی کیا توقع کی جاسکتی تھی؟ لیکن محمد علی جوہر پُر امید تھے کہ ابن مسعود یقیناً شرعی جمہوریت کو نافذ کریں گے۔ محمد علی کے مخالفین انہیں وہابی، اور قبہ شکن، کہنے لگے۔ اُن پر اپنے پیر مرشد سے اختلاف کی بناء پر آئین طریقت کی رو سے کفر کا الزام لگایا، لیکن محمد علی خلافت کے قیام کی خواہش میں اس انتہاء کو پہنچ چکے تھے کہ انہوں نے اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا کہ ابن مسعود نے خلافت تک پہنچنے کیلئے منفی راستے کا انتخاب کیا ہے۔ درحقیقت ابن مسعود کے نزدیک خلافت کا قیام نہیں، بلکہ اقتدار کا حصول مقصود تھا۔

محمد علی جوہر نے اپنے سیاسی خیالات ونظریات اور مرشد کے احترام کو الگ الگ خانوں میں رکھا۔ اسی زمانے میں وہ لکھنو گئے تو اپنے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محل سے ملنے فرنگی محل بھی گئے۔ محمد علی نے حجاز کے صحیح حالات معلوم کرنے کیلئے خلافت کانفرنس کی طرف سے ایک وفد بھیجا، جسکے سربراہ بہار کے مشہور لیڈر مولوی محمد شفیع داؤدی (۱۸۷۹ء تا ۱۹۴۹ء) اور اراکین میں مولوی قمر احمد، مولانا عرفان، شیخ عبدالمجید (۱۸۸۹ء تا ۱۹۷۸ء سندھ) حافظ عثمان اور مولانا عبدالحکیم صدیقی (جمعیت العلماء) وغیرہ تھے[۱۲]۔ وفد نے ابن مسعود کو مسلمانانِ ہند کے جذبات سے آگاہ کیا۔ ابن مسعود نے وعدہ کیا کہ شہید کی گئی مساجد، مزار اور قبریں دوبارہ بنوائیں گے۔ ابن مسعود کا یہ وعدہ کہ وہ ان مقامات کو دوبارہ بنوائیں گے اس بات بین ثبوت تھا کہ انہوں نے ہی انہیں مسمار کیا ہے۔ اسکے باوجود محمد علی ابن مسعود کے طرفدار رہے، صرف قیام خلافت کی آس پر۔ لیکن محمد علی نے دوسرے پہلو کے بارے میں نہ سوچا کہ ایسی خلافت کا کیا فائدہ جسکے قائم کرنے والے اسکی اہلیت وقابلیت ہی نہیں رکھتے۔ برائے نام یا رسمی ادارہ خلافت کا کیا فائدہ تھا۔ دوسرے طرف ابن مسعود کا مخالف گروہ ہر بات کو بڑھا چڑھا کر پروپگنڈے کا رنگ دے رہا تھا۔ ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء کو اچانک یہ خبر پھیل گئی کہ نجدیوں نے مدینہ منورہ پر حملہ کر کے مسجد نبویؐ اور مزار اطہر کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ سیدنا حضرت حمزہؓ کی قبر شہید کر دی ہے وغیرہ وغیرہ[۱۳]۔ لیکن حقیقت حال معلوم کرنے کے بعد پتہ چلا کہ ان خبروں میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ حجاز میں جنگ کے اختتام پر جب جمہورت کے قیام کا مسئلہ پیدا ہوا تو محمد علی نے سید سلیمان ندوی کی سربراہی میں ایک وفد ترتیب دیا۔ جسکے ارکان میں مولانا عرفان، مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۲ء تا ۱۹۵۶ء)، سید خورشید حسین، مولانا عبدالماجد بدایونی اور شعیب قریشی تھے۔ سید سلیمان ندوی انہی دنوں علیل ہو گئے اور وہ وفد کے ساتھ نہ جا سکے۔ مولانا عبدالماجد بدایونی بھی نہ جا سکے۔ یہ وفد اکتوبر ۱۹۲۵ء کو حجاز گیا[۱۴] لیکن ارکان وفد میں اختلاف پیدا ہو گیا مولانا ظفر علی خان ابن مسعود کے حامی بن گئے، جو ارکان وفد کو پسند نہ تھا[۱۵]۔ وفد ابھی حجاز ہی میں تھا کہ

ابن مسعود نے مدینہ منورہ پر قبضہ کرلیا۔اور شاہ حجاز بننے کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کردئے۔یہ حالات جان کر محمد علی جوہر کو سخت صدمہ ہوا۔وہ تو یہ اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ ابن مسعود کے ذریعے حجاز میں ملوکیت ختم ہو کر جمہوری اور شرعی حکومت قائم ہو جائے گی۔اس مسئلے پر انہوں نے اپنے محسنوں سے بھی اختلاف مول لیا۔جسکے لئے انھیں بیک وقت تین محاذ ں پر لڑنا پڑا۔

1۔ ایک تو جمہور مسلمین کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے قبر پرستی کے جذبات فاسد کو دور کرنے کی کوشش کی۔

2۔دوسرے انکے بڑے گہرے دوست، بزرگ اور مرشد مولانا عبدالباری فرنگی جوانکا قوت بازو تھے۔ جنھیں وہ امت مسلمہ کیلئے بے حد مفید قرار دیتے تھے اور تحریک خلافت میں انکی خدمات گراں قدر تیں، اُن سے بھی اختلاف مول لے لیا۔

3۔تیسرا محسنوں سے اختلاف اور رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کیلئے جدوجہد کرنا پڑی۔اپنے شریک کار، معتمد خاص، مخلص دوست مولانا عبدالماجد بدایونی (۱۸۹۸ء تا ۱۹۷۰ء) اپنے رفیق زنداں نثار احمد کانپوری اور مہاراجہ محمود آباد (۱۸۷۸ء تا ۱۹۳۱ء) کی مخالفت کرتے ہوئے انکے عقائد کو باطل قرار دیا [۱۶]۔اپنے دعویٰ کو دلائل سے صحیح ثابت کیا، اور انکے اَدعا کو دلائل سے پارہ پارہ کیا۔انکا قلم، زبان اور اخبار اسی مقصد کی تعلیم کیلئے وقف تھے۔ مخالفین کی طرف سے شب وشتم کیا گیا، ذلت ورسوائی برداشت کی۔مگر محمد علی جوہر ڈٹے رہے اس عقیدے کے ساتھ کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا تیرے لئے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے۔

دراصل محمد علی جوہر کا ایمان تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں صحیح ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کیلئے کر رہے ہیں۔ محمد علی اگر قبہ پرست نہیں تھے تو ابن مسعود کی کوششوں کے حامی بھی نہیں تھے۔ انکا کہنا تھا کہ حجاز مقدس بالخصوص کعبۃ اللہ پر شعیہ۔ سنی۔ حنفی۔ وہابی۔ مالکی۔ حنبلی اور شافعی وغیرہ سبکا برابر حق ہے۔ اسلیئے مختلف فی مسائل میں حکومت کو دخل نہیں دینا چاہئے اگر آج ابن مسعود کی حکومت اپنے عقائد کی بناء پر قبور کو منہدم کر سکتی ہے تو کل وہاں شیعوں کی حکومت قائم ہو جائے تو وہ مزار رسولؐ سے حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکرؓ کے جسد پاک اپنے عقیدے کے مطابق الگ بھی کر سکتی ہے۔ لہذا ایسی مختلف فیہ چیزوں میں مداخلت ہی نہیں کرنی چاہئے جسکا تعلق اور جنکے جواز کا پہلو فقہیہ اور تصفیہ سے کچھ بھی نکلتا ہو۔ اسلیئے وہ ''ہدم قبور و مقابر'' کے خلاف تھے [۱۷]۔

محمد علی جوہر نے خلافت کانفرنس میں بصدارت ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء تا ۱۹۵۸ء) خلافت کمیٹی سے یہ تجویزیں منظور کرالیں کہ حجاز میں ملوکیت نہ ہو اور موتمر اسلام کا انعقاد ہو۔ جس میں عالم اسلام کے نمائندے شریک ہوں اور اگر وہ فیصلہ کر دیں کہ مسمار شدہ مقابر کی مرمت کی جائے تو ابن مسعود پر اسکی تعمیل لازم ہوگی [۱۸]۔ ابن مسعود نے یہ جواز پیش کیا تھا کہ ایسی حرکتیں انکے حکم کے بغیر داخلہ کے وقت فوج سے اضطراباً سرزد ہو گئیں۔ لیکن یہ جواز بے معنی تھا۔ اگر فوج نے اپنی مرضی سے ایسا کیا تھا تو اسکے خلاف کاروائی کیوں نہ کی گئی۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ فوج انکے کنٹرول سے باہر تھی۔ لیکن ابن مسعود کی خاموشی کا مقصد رضامندی نہ سہی، نیم رضامندی ضرور تھا۔ مسئلہ حجاز سے متعلق مولانا عبدالباری فرنگی محل سے محمد علی جوہر کا اختلاف ذاتی نہیں نظریاتی تھا۔ لیکن وہ انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اس میں محمد علی کے جذباتی پہلو کو بھی زیادہ دخل حاصل تھا۔ جنوری ۱۹۲۶ء میں انہوں نے ہمدرد، میں مولانا عبدالباری فرنگی محل سے قطع تعلق کا اعلان بھی شائع کر دیا۔ محمد علی جوہر کے بارے میں عبدالماجد دریابادی تحریر کرتے ہیں کہ،

''وہ محض حق کا طالب اور حق کا ساتھی تھا، جس چیز کو اس نے حق سمجھ لیا پس

دانت سے پکڑ لیا، پھر چاہے اس میں سب ہی کا ساتھ چھوڑ دینا پڑے۔
حق کے معاملے میں پرواہ نہ کی دوست کی، نہ عزیز کی، نہ بزرگ کی، نہ خورد
کی، نہ اپنے محسن کی، نہ اپنے مرشد کی'' [19]

محمد علی جوہر اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھے۔ اُن پر یہ شعر صادق آتا ہے کہ

گفتار کے اسلوب پر قابو نہیں رکھتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

قطع تعلقی کے اعلان کے چار روز بعد ۱۹، اور ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء کی درمیانی شب مولانا عبدالباری فرنگی محل کا انتقال ہوگیا۔ شومئی قسمت جس دِن محمد علی جوہر کا یہ اعلان شائع ہوا۔ اُسی روز ابن مسعود نے اپنی بادشاہیت کا قیام کا اعلان کر دیا اور حجاز کے بادشاہ بن بیٹھے۔ ابن مسعود کے اس اقدام سے محمد علی کی اُمیدوں کے قلعے پر بجلی گر پڑی۔ جسکی حمایت میں انہوں نے اپنے مرشد تک کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، اس نے خود انکا ساتھ چھوڑ دیا، اب محمد علی ابن مسعود کے خلاف تھے لیکن پنجاب میں مولانا ظفر علی خان انکے حامی بن گئے۔

۱۹۲۶ء میں ابن مسعود نے ایک ''بلاغ عام'' کے ذریعے مُوتمر کے انعقاد کا اعلان کیا۔ ہندوستان میں اسکے دعوت نامے خلافت کانفرنس، جمعیت العلماء اور اہل حدیث کانفرنس کے نام آئے۔ محمد علی جوہر کی رائے سے خلافت کانفرنس کی طرف سے ایک وفد سید سلیمان ندوی کی سربراہی میں موتمر میں شرکت کیلئے ترتیب دیا گیا۔ جس کے اراکین میں مولانا شوکت علی (۱۸۷۳ء تا ۱۹۳۸ء)، مولانا محمد علی جوہر اور شعیب قریشی تھے [20]۔ محمد علی اس وفد کے ساتھ اس اُمید پر گئے تھے۔ کہ وہاں شرعی جمہوریت قائم کرائیں گے۔ لیکن وہاں پہنچے تو ملوکیت کی قہرمانی اور نجدیت کی کرختگی دیکھی، بڑے بڑے مشاہیر کی قبریں مسمار کر دیں گئی تھیں۔ جمہوریت کا نام ونشان تک نہ تھا۔ وفد حجاز پہنچا تو خبر ملی کہ

مدینہ منورہ میں جنت البقیع کے مزارات کے قبے بھی گرا دیئے گئے ہیں۔ابن مسعود سے وفد کی پہلی ملاقات ۲۷ مئی ۱۹۲۶ء کو، دوسری ملاقات ۳۰ مئی ۱۹۲۶ء کو، اور آخری ملاقات ۶، جولائی ۱۹۲۶ء کو ہوئی [۲۱]۔وفد نے مقابر و مآثر کی الگ الگ حیثیتوں پر بات کی۔اور اس بات پر بھی زور دیا کہ اگر اہل نجد واقعی کتاب وسنت کے قائل ہیں تو پھر حکومت کے سربراہ کا انتخاب شرعی ہو، جمہوری ہو اور خاندانی وراثت سے پاک ہو۔حجاز پر فقط سلطان نجد کی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کی بادشاہیت ہو، وفد نے ان تمام باتوں کو قابل عمل بنانے کی کوشش موتمر اسلامی کے ذریعے بھی کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔آخر محمد علی نے ابن مسعود کے جاہ وجلال اور عظمت و جبروت کے باوجود موتمر میں پورے جوش سے اسے مخاطب کر کے کہا:

''یہ ملوکیت کیسی، اسلام میں تو شخصیت کی بیخ کنی کی گئی ہے شوریٰ اور جمہوریت کو تفوق حاصل ہے۔تم کتاب وسنت کے تمسک کے داعی ہو۔پھر یہ قیصر و کسریٰ کی پیروی کیوں؟'' [۲۲]

اگست ۱۹۲۶ء میں وفد ہندوستان آیا تو محمد علی نے آخری چاہ کار کے طور پر یہ اعلان کیا کہ اگر سعودی حکومت راہ راست پر نہ آئے تو عالم اسلام کے مسلمان حج پر نہ جائیں۔اسطرح حکومت سعودیہ پر معاشی دباؤ پڑے گا۔ اور وہ راہ راست پر آجائے گی۔لیکن اب صورتحال یہ پیدا ہو چکی تھی کہ مولانا ظفر علی خان جو ابن مسعود کے سخت مخالف تھے، وہ ان کے حامی بن گئے تھے۔پنجاب خلافت کمیٹی باغی ہوگئی اور اس نے ابن مسعود کی حمایت شروع کر دی۔لہذا مسلمانوں کا ایک طبقہ محمد علی جوہر کے مشورے کے قبول کرنے کے بجائے انکا مخالف ہوگیا۔حیرت کی بات ہے کہ محمد علی جوہر تو ابن مسعود کی حمایت کر کے معتوب و مغضوب ہو گئے۔حالانکہ جب انہوں نے محسوس کیا کہ ابن مسعود کے اقدامات جمہوریت کے منافی ہیں تو انھوں نے حمایت ترک کر دی، لیکن جب پنجاب خلافت کمیٹی اور مولانا ظفر علی خان

وغیرہ ابن مسعود کے حامی بن گئے تو وہ قابل گرفت کیوں نہ ہوئے؟ دراصل محمد علی جوہر کے مخالفین انکی سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچا کر اپنی دکان سیاست چمکانا چاہتے تھے۔ آسکے علاوہ اس میں لسانی اور صوبائی عصبیت کا بھی بڑا دخل تھا۔

محمد علی جوہر کے بارے میں یہ پروپگنڈہ کیا جاتا ہے کہ وہ غلط یا صحیح جس بات پر ڈٹ جاتے تھے، پھر اس میں لچک ممکن نہیں تھی، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ مسئلہ حجاز کے سلسلے میں محمد علی جوہر نے ''اختلافات ونزع'' کو ختم کروانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس پر سمجھوتہ کر لینا چاہا کہ ابن مسعود کو موقع دیں کہ وہ اپنے وعدے ایفا کریں۔ یعنی موتمر اسلامی منعقد کرائیں۔ اگر وہ مطالبات قبول کریں تو بہتر، ورنہ میں آپکے ساتھ ہوں۔ اور جو کوششیں آپکی حمایت اور ابن مسعود کی مخالفت میں کرسکتا ہوں، کرونگا ۲۳۔ لیکن مخالفین نے محمد علی کی اس مثبت اور احسن پیشکش کو رد کر دیا، قومی اتحاد و مفادات کی پرواہ کئے بغیر نتیجہ یہ نکلا کہ اختلاف روز بروز بڑھتا چلا گیا، اور محمد علی کا وہ حال ہوا کہ

بات بھی کھوئی التجا کر کے
کیا ملا عرضِ مدعا کر کے

محمد علی جوہر کے مخالفین جو پہلے ابن مسعود کے مخالف اور اب انکے حمائتی بن چکے تھے، انھوں نے محمد علی کے خلاف یہاں تک پروپگنڈہ کیا تھا کہ انھوں نے ابن مسعود سے بھاری رقوم رشوت کے طور پر حاصل کیں ہیں۔ بقول محمد علی

> ان نجدی بندوں سے اتنا اور کہنا ہے کہ تم جھوٹ بولتے ہو تب بھی کورانہ تقلید سے احتراز نہیں کرتے اور یوں غیر مقلد کہلاتے ہو، کیا تم بھول گئے ہو کہ یہی الزام ہم پر شریف حسین اور امیر علی نجدی گرگوں نے لگایا تھا۔ مشیر حسین قدوائی صاحب آج بھی زندہ ہیں۔ کل تو انھیں اندیشہ رہا ہوگا کہ نجدی اور غیر مقلد گروہ کے ہم حمایتی ہیں اسلیئے انکے ذریعے سے

اس رشوت کا پتہ نہ چل سکے گا، لیکن آج تو یہ جماعت ہمارے خون کی پیاسی ہے، پھر آج اس سے کیوں نہیں پوچھ لیا جاتا کہ کتنی رشوتیں ہمیں دی گئی تھیں اور کب کب؟ اور کہاں کہاں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم کل جہاں تھے وہیں آج ہیں۔ اور کل جو حق و انصاف کی ہمیں ہمیں شریف حسین اور امیر علی کے خلاف اور سلطان ابن مسعود کی حمایت میں دوڑا رہی تھی ، وہی آج سلطان ابن مسعود ملکیت حجاز اور توہین قبور و مآثر کے خلاف دوڑا رہی ہے۔ ہم پہلے بھی حق کے ساتھ تھے اور آج بھی حق کے ساتھ ہیں۔ رہے یہ سلطان ابن مسعود کے حمائتی یا شریف حسین کے حمائتی اور سلطان ابن مسعود کے دشمن، نہ یہ پہلے حق کے ساتھ تھے نہ آج حق کے ساتھ ہیں۔ پہلے بھی یہ کسی نہ کسی فریق کے حمایتی تھے اور دوسروں کے دشمن، اور آج بھی یہ کسی نہ کسی فریق کے حمایتی ہیں اور دوسروں کے دشمن، نہ انھیں حق سے واسطہ، نہ باطل سے سروکار[۲۴]۔

محمد علی جوہر حق بات کہنے میں نہ کبھی رُکے اور نہ دبے۔ وہ جو کچھ کہتے اس میں ذاتی کی بجائے اسلامی جذبہ غالب ہوتا، وہ تو اپنی نظر بندی اور قید کو بھی اسلامی دولت سمجھتے تھے۔ اسلیئے انھوں نے کہا تھا کہ

میں کھو کے تری راہ میں سب حاصل دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

ایک سوال ذہنوں میں یہ ابھرتا ہے کہ جس شدت کے ساتھ محمد علی جوہر نے ابن مسعود کی حمایت کی تھی تو پھر اسی زور و شور سے اختلاف کیوں کیا؟ اسی سلسلہ میں یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہئے کہ مقابر و قبور کے بارے میں جتنی خبریں ہندوستان پہنچیں، ان میں سے اکثر کو ابن مسعود کی طرف سے ''مبالغہ آمیز'' قرار دیا گیا[۲۵]۔ پھر یہ بھی وعدہ

کیا گیا کہ موتمر عالم اسلام کے فیصلے کے مطابق انکا آئندہ انتظام کیا جائے گا۔ بار بار اس چیز کا اعلان کیا گیا کہ حجاز میں شخصی حکومت مقصود نہیں ہے، بلکہ جمہوری طرز پر وہاں خلفاء راشدین کا سا نظام قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔ یہ وعدے حکومت ابن مسعود کی طرف سے مسلسل جمعیت خلافت سے کئے گئے نیز محمد علی جوہر کے نام ذاتی مکاتیب ومراسلات میں بھی انکا اعادہ کیا گیا[۲۶]۔ لیکن جب وفد کے ارکان (جو مسٹر شعیب قریشی، مولانا عرفان اور مولانا ظفر علی خان پر مشتمل تھا) نے اپنے مشاہدات کی بنیاد پر مظالم ابن مسعود کی تصدیق کی، اور مزید احتیاط کیلئے مسمار شدہ مقامات کی تصاویر بھی بجھوائیں۔ بعد ازاں محمد علی جوہر نے خود بھی ان مقامات کا مشاہدہ کیا، اور اس نتیجے پر پہنچے کہ جو کچھ کہا جارہا ہے وہ صحیح ہے، اور سلطان تلافی پر آمادہ نہیں ہیں۔ تو انکا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔ وعدے یاد دلا کر انکے ایفا کی کوشش کی، مگر ناکامی کی صورت میں علَم مخالفت محمد علی کے ہاتھ میں تھا۔ مگر مقام حیرت ہے کہ خلافت کمیٹی کی پالیسی، ہدایات اور نصب العین سے جن لوگوں کو کامل اتفاق تھا، جنکی تائید اور صدارت سے یہ چیزیں پاس ہوئی تھیں اور ابن مسعود کو بھیجی گئی تھیں، انھوں نے ہی نہایت شد ومد سے محمد علی کی مخالفت کی، حکومت کی حمایت کی اور ابن مسعود کی وعدہ خلافیوں پر پردہ ڈالنا چاہا۔ یہ تھے محمد علی کے اسباب اختلاف اور انکے رفقاء کار کا طرز عمل۔ ان تمام ہنگامہ خیزیوں میں صاف طور پر محسوس ہوتا ہے کہ محمد علی کا طرز عمل یقیناً حق بجانب تھا ایک مومن کی طرح، پھر ایک مسلم کی طرح تعلقات کی تمام زنجیروں کو توڑ کر انھوں نے کسی بھی مخالف کی پرواہ نہ کی اور جو حق سمجھتے تھے اسکا اعلان کر دیا۔

محمد علی جوہر کے اس اختلاف واتفاق کے متعلق خواجہ حسن نظامی (۱۸۷۸ء تا ۱۹۵۵ء) نے نہایت بے لاگ رائے دی ہے، محمد علی جب موتمر اسلامی میں شرکت کے بعد ہندوستان آئے تو جامع مسجد دہلی میں مسلمانانِ دہلی کی طرف سے خواجہ صاحب نے محمد علی اور انکے رفقاء کیلئے ایک سپاسنامہ پیش کیا تھا۔ جلسہ میں محمد علی نے بھی تقریر کی تھی، خواجہ صاحب اپنے ۲۲، اگست ۱۹۲۶ء کے روزنامچہ میں اس جلسہ اور محمد علی کے متعلق یوں رقمطراز ہیں کہ

بعد مغرب جلسہ شروع ہوا، جامع مسجد کے جلسوں میں اتنا مجمع میں نے کبھی نہیں دیکھا، پندرہ بیس ہزار آدمی تھے۔ مولانا محمد علی صاحب کی تقریر کا حاضر پر بہت اچھا اثر ہوا۔ میرا اعتماد تو یہ ہے کہ علی برادران اسلام کے سچے عاشق ہیں۔۔۔۔ انھوں نے محض اس وجہ سے پہلے ابن مسعود کی حمایت کی کہ اُنھیں یقین تھا کہ ابن مسعود بُرا آدمی نہیں ہے۔ اور قبہ شکنی کی خبریں مبالغہ آمیز اور غلط ہیں اور اس معاملہ میں وہ اتنے ثابت قدم رہے کہ اپنے مرشد مولانا عبدالباری صاحب سے بھی موافقت پر راضی نہیں ہوئے۔ لیکن جب انھوں نے خود حجاز جا کر اپنی آنکھوں سے سب واقعات کو دیکھ لیا تو اب وہ ایمانداری کے ساتھ ابن مسعود کی مخالفت کر رہے ہیں'' ۲۷۔

مگر افسوس کہ مخالفین نے اختلاف و مخالفت پر ہی قناعت نہ کی بلکہ تہمت تراشیوں اور سب و شتم کا بازار گرم کر دیا۔ ستم یہ کہ انپر محمل سے محمل اور غلط قسم کے الزامات عائد کئے گئے۔ اسی زمانہ میں مصری محمل کا واقعہ پیش آ گیا۔ اس میں بھی محمد علی جوہر کو مورد الزام ٹھہرانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ مصر ہر سال ایک خوبصورت آراستہ پیراستہ غلاف کعبہ کیلئے بھیجتا تھا۔ اس رسم کی ادائیگی کے دوران گانے بجانے اور موسیقی کا اہتمام ہوتا تھا۔ لیکن جب سے وہابی حکمران برسر اقتدار آئے تھے، انھوں نے اس رسم کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ ۱۹۲۶ء کو محمل جدہ پہنچا تو مصری آفسروں کیلئے تین شرائط عائد کر دیں گئیں کہ

1۔ اوّل یہ کہ بینڈ نہ بجایا جائے۔

2۔ دوم سگریٹ نہ پئے جائیں۔

3۔ سوئم اسلحہ وغیرہ جدہ ہی میں چھوڑ کر آئیں،

جنھیں مصری افسروں نے قبول کرلیا۔۵، ذی الحجہ کو مؤتمر کا اجلاس ہوا، ۶، ذی الحجہ کو عبدالقادر شیبی کے مکان پر غلاف کعبہ آیا، جو مصری فوج کے سپاہی گھوڑوں اور پیادوں کی صورت میں لائے۔غلاف کعبہ تقریباً دس بھاری بھاری صندوقوں میں بند تھا۔استقبال کیلئے اراکین موتمر، عمائدین مکہ مکرمہ اور اراکین حکومت موجود تھے۔محمد علی جوہر بھی وہاں پہنچے، حقیقت یہ ہے جس کمرے میں بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا کثرت تعداد کی وجہ سے چھوٹا پڑ گیا۔محمد علی جگہ کم ہونے کی وجہ سے دیگر اراکین سے ملنے کی بجائے ایک طرف کمرے میں جا کر بیٹھ گئے، آنے والے مصری افسر بھی محمد علی کے پاس بیٹھ گئے۔مخالفین نے اس چیز کو غلط رنگ دیکر پروپگنڈہ کیا کہ وہ ایک طرف بیٹھ کر مصری افسروں کے ساتھ سازش کر رہے تھے، حالانکہ محمد علی جوہر کو اپنا بیان ہے کہ مصری افسر سے انکی مصر سے متعلق لارڈ لائڈ اور سعد زاغلول پاشا کے جھگڑے والے معاملے پر گفتگو ہوئی، جسکا ۱۷، جون کو ایک عالم میں چرچا تھا[۲۸]۔اسکے علاوہ محمد علی ان سے اپنے خاص مصری دوستوں ڈاکٹر عبدالمجید بے سعید (حزب الوطنی)، ڈاکٹر فواد، ڈاکٹر بہجت وہبی، عبدالستار بے الباسل، اپنے اکسفورڈ کے ساتھی محمد پاشا محمود اور اراکین وفد مثلاً سعد پاشا زاغلول اور حامد پاشا الباسلی کے متعلق پوچھتے رہے، جس سے قیاس کر کے مولانا ظفر علی خان کے اخبار ''زمیندار''، لاہور نے تہمت تراشی کی کہ محمد علی جوہر نے دستہ مصری محمل کے افسر عزمی پاشا سے درخواست کی ہے کہ وہ حکومت مصر کو سلطان ابن مسعود پر حملہ کیلئے آمادہ کریں، جو کہ بُہتانِ عظیم تھا جسکا محمد علی جوہر نے تسلی بخش، مدلل اور مفصل جواب ہمدرد میں دیا ہے[۲۹]۔یہی ایک ملاقات تھی جو واقعہ محمل اور وقوفِ عرفان سے قبل انکی مصری افسروں سے ہوئی۔جسکو روزنامہ ''زمیندار'' کی ادارات میں مسٹر غلام رسول مہر (مدیر روزنامہ ''انقلاب لاہور'') نے غلط رنگ دیکر پیش کیا[۳۰]۔

واقعہ مصری محمل سے متعلق محمد علی جوہر رقمطراز ہیں کہ مصری فوج اور نجدیوں میں بمقام منیٰ ۸، ذی الحجہ کو ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا۔ہوا یہ کہ بگل کے ذریعے مصری فوج کو احکام

دینے پر نجدیوں نے مصریوں پر پتھر برسانے اور محمل کو صنم کہنا شروع کر دیا، اور مصری پاشا جو فوج کے کمانڈنگ آفیسر اور امیر الحج تھے، کو بُرا بھلا کہا، پاشا نے نجدی افسروں کو جو محمل کے ساتھ تھے اور جنکی تعداد تقریباً پچیس کے قریب تھی، کہا کہ نجدیوں کو ایسا کرنے سے روکا جائے، مگر وہ نہ رکے، سلطان تک اطلاع پہنچی تو انھوں نے پہلے اپنے ایک بیٹے کو، اسکی ناکامی کی صورت میں دوسرے بیٹے کو بھیجا، آخر حالات کی سنگینی دیکھ کر سلطان خود آ گئے لیکن جب سلطان بھی نجدیوں کو باز رکھنے میں ناکام رہے تو مصری پاشا نے سلطان کی اجازت سے انتظام اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے ہوا میں فائر کیا۔ لیکن نجدی باز نہ آئے۔ اور دو مصری سپاہی اور ایک آفیسر زخمی ہو گئے۔ مصری پاشا نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ایک منٹ تک محمل کے ارد گرد فائر کریں، جس سے بیس نجدی مارے گئے بہت سے اونٹ ضائع ہوئے۔ اور کچھ حاجی بھی مارے گئے، یہ واقعہ رات کے وقت پیش آیا، اسلئے نجدیوں کے علاوہ بلا ارادہ گولیاں اوروں کو بھی لگ گئیں۔ ۳۱

مصری محمل والے واقعہ کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے حکومت مصر نے حج کی رسم ادا کیئے بغیر اپنے وفد کو غلاف سمیت واپس بلا لیا، آئندہ دس سال تک دونوں حکومتوں کے درمیان رنجش باقی رہی، ۱۹۳۶ء میں ابن مسعود اور حکومت مصر کے درمیان دوستی کا سمجھوتہ ہوا۔ اور غلاف کعبہ کی رسم دوبارہ بحال ہو گئی۔

جہاں تک محمد علی جوہر کی مصری افسروں سے ملاقاتوں کا تعلق ہے، حج کے بعد تین ملاقاتیں ہوئیں، پہلی ملاقات ۱۴، ذی الحجہ شب جمعہ تکیہ مصری میں ہوئی۔ جسکی حیثیت ایک عام نشست کی تھی، جس میں اراکین حکومت حجاز اور اراکین موتمر شریک تھے، یہی پر محمد علی جوہر کی ملاقات مصری قونصل امین توفیق بے سے بھی ہوئی۔ اور معلوم ہوا کہ

حکومت مصر نے بھی موتمر میں شرکت کیلئے ایک وفد بھیجا ہے۔ جس میں تو نصل موصوف بھی شریک ہیں۔ محمد علی جوہر کی دوسری ملاقات اگلے دِن ۱۵، ذی الحجہ بروز جمعۃ المبارک مصری افسروں سے بمقام جردل مصری کیمپ میں ہوئی۔ جہاں مصر، ہندوستان اور اسلام سے متعلق ان سے گفتگو ہوئی۔ موتمر کے اجلاس میں بطور وزیٹر عزمی پاشا آئے تو محمد علی جوہر کی وہیں ان سے ملاقات ہوئی، مگر یہاں بھی سرگوشی یا تنہائی کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ان سرسری ملاقاتوں کے علاوہ آخری ملاقات بھی بمقام جردل مصری کیمپ میں ہوئی۔ یہ ملاقات ۱۶، ذی الحجہ اور ۲۶ ذی الحجہ کے درمیان ہوئی تھی۔ اگر چہ یہ سب غیر متعلق بحث ہے، اسلیئے کہ یہ منیٰ سے واپسی کے بعد کی ملاقاتیں ہیں۔ اور مصری محمل والا واقعہ اس سے کافی دِن پہلے رونما ہو چکا تھا، حالانکہ تمام ملاقاتوں میں دیگر اراکین کے علاوہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عرفان موجود ہوتے تھے۔ جنھوں نے من وعن تمام حالات وواقعات سے غلام رسول مہر کو آگاہ بھی کیا تھا۔ پھر بھی تعجب ہے کہ مہر صاحب نے معتبر ترین اور قابل اعتماد شخصیت سید سلیمان ندوی کے علاوہ اپنے ''مفتیٔ خاص'' کی شہادت کو کیوں رد کر دیا، کیا وہ راوی تو ثقہ نہیں مگر مفتی معتبر ہیں؟ ''افتوٗ منون ببعض الکتب و تکفرون ببعض ''والا معاملہ نظر آتا ہے۔

محمد علی جوہر کی مصری کمانڈر کے ساتھ پہلے ہی سے شناسائی تھی، اگر شناسائی نہ بھی ہوتی تو ایک مسلم حکومت کے مسلم عہدہ دار سے ملنا کوئی اخلاقی، قانونی یا شرعی جرم نہ تھا۔ لیکن مصری کمانڈر اور مصری وفد کے ساتھ محمد علی جوہر کی ملاقاتوں کو غلط رنگ دیا گیا۔ اور ہندوستان میں یہ مشہور کر دیا گیا کہ محمد علی نے مصری کمانڈر کو ترغیب دی تھی کہ وہ اسلامی فوج کے ایک حصے پر گولیاں چلائے۔ اس سلسلے میں مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا عرفان، اور مولانا عبدالحلیم (۱۸۷۶ء تا ۱۹۵۳ء) کو دھمکی دی گئی کہ وہ محمد علی جوہر کے خلاف بیان دیں، مگر ان صاحبان نے مخالفین کی بات ماننے کی بجائے جراتمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے الزام کی تردید کر دی، اور اس واقعہ سے قطعی لاعلمی اور بے تعلقی کا بیان دیا تو

تلاطم کچھ کم ہوا[۳۲]۔

حوالہ جات

۱۔ محمد امین زبیری، سیاست ملیہ، آگرہ، ۱۹۴۱ء، ص ۲۱۱؛

K.K.Aziz, *Britain & Muslim India*, London, 1963, p-89.

۲۔ ابوسلمان شاہ جہانپوری، مولانا محمد علی اور انکی صحافت، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ص ۳۹۔۴۰؛

عبدالماجد دریا آبادی، خطوط مشاہیر، لاہور، ۱۹۴۴ء، ص ص ۲۸۲۔۲۸۷۔

۳۔ Chaudhry Khaliq-uz-Zaman, *Path Way to Pakistan*, Karachi,1993, pp.75-85;

M. Ikram, *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, Lahore,1977, pp.227-228.

۴۔ M. Hasan, *Nationalism and Communal Politics in India 1916-1928*, Delhi,1979, pp.132-135;

I.H. Qureshi, *Ulama in Politics*, Karachi,1972, pp.203-211.

۵۔ سید حسن ریاض، پاکستان ناگزیر تھا، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۵۴۔

۶۔ رئیس احمد جعفری، مطائبات محمد علی، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۵ء، ص ۴۴۔

۷۔ رئیس احمد جعفری، سیرت محمد علی، دہلی، ۱۹۳۳ء، ص ۳۸۲؛

سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا محمد علی کی یاد میں، اعظم گڑھ، ۱۹۸۲ء، ص ۱۵۴۔

۸۔ رئیس احمد جعفری، نگارشات محمد علی، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۴ء، ص ص ۴۱۔۴۶۔

۹۔ I.H.Qureshi, *Ulama in Politics*, Karachi,1972, pp.223-225;

محمد امین زبیری، بحوالہ سابقہ، ص ۳۱۵۔

۱۰۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بحوالہ سابقہ، ص ص ۱۵۵۔۱۵۶؛

رئیس احمد جعفری، مقالات محمد علی، حصہ اوّل، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۳ء، ص ص ۷۲۔۹۱۔

۱۱۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی، محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق، حصہ اوّل، اعظم گڑھ، ۱۹۵۲ء، ص ص ۲۵۰۔۲۵۴۔

۱۲۔ رئیس احمد جعفری، نگارشات محمد علی، ص ۶۳؛
ایضاً، کاروانِ گم گشتہ، کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ص ۲۰۔۲۱۔

۱۳۔ مولانا محمد علی جوہر، روزنامہ ہمدرد، ۲۵۔۲۸، اکتوبر ۱۹۲۶ء، دہلی؛
ماہنامہ، معارف، اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۳۱ء، ص ص ۱۲۹۔۱۳۲۔

۱۴۔ رئیس احمد جعفری، علی برادران، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ص ۳۲۱۔۳۳۰؛
مولانا ظفر علی خان، رپورٹ وفد حجاز، ۱۹۲۶ء، لاہور، س۔ن۔

۱۵۔ عبدالماجد دریا آبادی، محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق، حصہ اوّل، اعظم گڑھ، ۱۹۵۲ء، ص ص ۳۳۵۔۳۳۹۔

۱۶۔ اقبال احمد صدیقی، قائداعظم اور انکے سیاسی رفقاء، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ص ۲۰۲۔۲۱۸۔

۱۷۔ مفتی انتظام اللہ شہابی، مشاہیر جنگ آزادی، کراچی، ۱۹۵۷ء، ص ۲۸۵۔

۱۸۔ Shan Mohammad, *The Indian Muslim 1900-1947*, Vol.VIII, pp.14-23.

۱۹۔ عبدالماجد دریا آبادی، محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق، حصہ دوئم، اعظم گڑھ، ۱۹۵۲ء، ص ۱۵۱؛
سید نظر برنی، مولانا محمد علی شخصیت اور خدمات، دہلی، ۱۹۷۱ء، ص ۱۷۷۔

۲۰۔ محمد صدیق ہزاری، تاریخ ساز شخصیات، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ص ۲۱۵۔۲۱۷؛
خورشید علی مہر، سیرت محمد علی، دہلی، ۱۹۳۱ء، ص ص ۱۱۱۔۱۱۳۔

۲۱۔ سید صباح الدّین عبدالرحمٰن، بحوالہ سابقہ، ص ۱۶۶۔

۲۲۔ رئیس احمد جعفری، سیرت محمد علی، ص ۳۹۷؛
راج موہن داس، مسلم افکار، فاروق شاہین (مترجم)، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ص ۱۴۲۔۱۹۱۔

۲۳۔ سید صباح الدّین عبدالرحمٰن، بحوالہ سابقہ، ص ۱۶۹۔

۲۴۔ رئیس احمد جعفری، مقالات محمد علی، حصہ اوّل، ص ص ۱۴۸۔۱۴۹۔

۲۵۔ خورشید علی مہر، بحوالہ سابقہ، ص ص ۱۴۵۔۱۵۳۔

۲۶۔ Afzal Iqbal, My Life, *A Fragment,* Lahore,1942,pp.219-220; Ibid, *Life and Times of Muhammad Ali,* Lahore,1979, pp.176-177.

۲۷۔ رئیس احمد جعفری، سیرت محمد علی، ص ۴۰۰۔

۲۸۔ ایضاً، مقالات محمد علی، حصہ اوّل، ص ۱۱۸۔

۲۹۔ روزنامہ ہمدرد، ۲۵۔۲۶۔۲۸، اکتوبر ۱۹۶۲ء، دہلی۔

۳۰۔ روزنامہ زمیندار، مولانا ظفر علی خان (مدیر)، ۲۳، اکتوبر ۱۹۲۶ء، لاہور۔

۳۱۔ رئیس احمد جعفری، مقالات محمد علی، حصہ اوّل، ص ص ۱۲۶۔۱۲۷۔

۳۲۔ ایضاً، ص ص ۱۱۸۔۱۵۱۔

اسلامی تحقیق میں روایت اور درایت کے اصول

عذرا وقار

اسلامی علوم میں ''تحقیق''، کے کام میں نہایت احتیاط برتی گئی ہے۔اس کے جانچ اور پرکھ کے اصول نہایت کڑے ہیں اور جو بات ان اصولوں کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتی اُسے ہمیشہ رد کر دیا گیا ہے۔قرآن الحکیم بار بار انقلابِ الامم کو پیش کرتا ہے اور تاریخ کی بہتری تعبیریں اس میں ملتی ہیں، جن میں قوانین فطرت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں نہ صرف تاریخ سے سبق حاصل کرنے کو کہا گیا ہے بلکہ اپنے اردگرد کے حالات کو دیکھنے، پرکھنے اور ان پر غور کرنے کا حکم بھی معبود ہے، یعنی خود چیزوں کا مشاہدہ کیا جائے اور دوسروں کی بیان کردہ باتوں کو من و عن تسلیم نہ کیا جائے۔

تحقیق کا مطلب تلاش، جستجو، تفتیش قرار پاتے ہیں۔اس میں کسی مخصوص موضوع پر مفصل تنقید کی جاتی ہے جس سے نئے حقائق معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ درست تعبیرات بھی ہو سکتی ہوں یعنی یہ ایک باضابطہ تعقلی اور تجربی طریقہ ہے جس سے مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ دور جدید میں تحقیق ایک الگ مضمون، ڈسپلن یا موضوع بن چکا ہے۔قرآن کریم میں علم حاصل کرنے کا مطلب ہی تحقیق قرار پایا ہے۔اس لئے اسلامی علوم میں تحقیق جزو لاینفک کے طور پر موجود رہی ہے۔قرآن کریم میں عمومی طور پر تفکر، تدبر اور تفقہ کے الفاظ استعمال ہوئے یعنی اسلام بنیادی طور پر تحقیق و دریافت کرنے کی طرف اِنسان کو راغب کرتا ہے یعنی کسی امر کو جاننے کے لئے محض سنی سنائی باتوں پر یقین کرنے کے بجائے اس کے دوسرے شواہد بھی ضروری ہیں۔مثلاً کیا کوئی بات عقلی طور پر اور روزمرہ کے مشاہدے کے مطابق ممکن بھی ہے یا نہیں اسی طریقے کو سائنس اور معروضی تحقیق کا نام دیا جاتا ہے۔